جناب عبدالمنعم السخر الازہری
ترجمہ: ڈاکٹر محمد ریاض

۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی کے عواقب اور مسلمان

(سلسلے کے لیے ملاحظہ ہو شمارۂ جنوری ۱۹۷۳)

ان دنوں انگریزی زبان اور عصری علوم و فنون سے تنفر اختیار کرنا مسلمانوں کا عام شیوہ بن گیا تھا اور معدودے چند دردمند افراد کو اس صورتِ حال سے بے حد رنج تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سرکاری زبان اور متداول علوم و فنون سے بے بہرہ رہنا، مسلمانوں کے لیے بے حد ضرر رساں ہوگا۔ اس طرح وہ ہر شعبۂ زندگی میں پسماندہ رہ جائیں گے اور ان کے حریف ہندو اور دیگر غیر مسلم بازی لے جائیں گے۔ مؤخر الذکر گروہ انگریزی زبان اور افرنگی علوم و فنون سے پورے ذوق و شوق کے ساتھ بہرہ مند ہو رہے تھے، مگر مسلمانوں کی اکثریت کو اپنی محرومی اور مستقبل کی پس ماندگی کا احساس نہ تھا۔ البتہ سر سید احمد خاں مرحوم اور ان کے ہم خیال روشن فکر حضرات نے ان خطرات کو بھانپ لیا تھا۔ انگریزوں کے دل مسلمانوں کے بارے میں صاف نہ تھے اور مسلمان ان بدیشیوں کو دین و ایمان کا غارت گر جانتے تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں کو اس بات کے لیے آمادہ کرنا کہ وہ اپنی اولاد کو انگریزی زبان اور مغربی علوم کی درسگاہوں میں بھیجیں، آسان کام نہ تھا۔ مسلمانوں کے خدشات بھی کم اہم نہ تھے کہ انگریزی درسگاہیں، مسلمانوں کو بے دین بنانے کے حربے ہیں۔ اس کے باوجود سر سید احمد خاں اور ان کے ہم نوا لوگوں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ مسلمان اپنے دینی علوم میں تبحر رکھنے کے علاوہ، جدید علوم و فنون کے اسلحہ سے بھی لیس ہوں۔ اس طرح انھیں اپنے وجود کا ثبوت دینے اور اپنے حقوق منوانے کے مواقع مل سکیں گے۔ ورنہ وہ اپنے دیگر ہم وطنوں کے شانہ بہ شانہ کام کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے۔

سر سیّد احمد خاں

یہ ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ ذہن غیر معمولی رسا پایا تھا اور ان کے والد متقی خاں نے انھیں مذہبی تعلیم دلوائی۔ مگر سید احمد نے مذہب کو زندگی کے امور سے منطبق کر کے دیکھنے کا ملکہ پایا تھا، اس لیے سنِ شعور کو پہنچ کر انھوں نے کتابِ زندگی سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کے خاندان والے بالعموم سرکاری ملازمت سے محترز رہے تھے مگر سر سید نے ملازمت اختیار کی اور دل لگا کر کام کیا۔ وہ معمولی حیثیت سے ترقی کرتے کرتے بعد میں شمالی ہندوستان کے علاقہ بجنور میں جج کے عہدہ پر فائز ہو گئے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں سر سید نے مبارزانِ حریت کا نہیں بلکہ انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک متحارب قوتوں کے درمیان طاقت کا توازن موجود نہ ہو، جنگ بے نتیجہ اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص نقصان رساں رہے گی۔ سر سید کی صائب الرائی بعد میں ثابت ہوئی۔ انھوں نے جنگِ آزادی (انگریزوں کی اصطلاح میں "غدر و بغاوت") کے زمانہ میں کئی انگریزوں، خصوصاً قیدیوں کی جان بچائی جس کی وجہ سے عام مسلمان ان کو گردن زدنی سمجھتے تھے مگر انگریز ان کے دوست اور پشتیبان تھے۔

مدرسۃ العلوم کے قیام کا خیال

عام مسلمانوں نے سر سید کی مخالفت کا بازار گرم کر رکھا تھا، مگر وہ ان کی بہی خواہی کی کوششوں میں محو تھے۔ انھوں نے دیوبند جیسے ایک اور شہر علی گڑھ میں جو دہلی کے جنوب مشرق میں ۶۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، ایک مدرسہ قائم کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ وہ اس مدرسہ کے ذریعے مسلمانوں کی کایا پلٹنے والے تھے۔ ان کیلئے ثروت مند اصحاب نے مالی معاونت کی اور یہ مدرسہ قائم ہو کر رہا۔ ۱۹۱۲ء میں اس مدرسے کو سرکاری اعانت حاصل ہو گئی اور چند سال بعد اس نے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر لیا۔

محمدن مدرسہ علی گڑھ کے قیام کی کوشش سر سید نے اس وقت شروع کی جب بعض شبہات کی بنا پر مسلمان ان کے خلاف تھے۔ انگریز دوستی سر سید کا شیوہ تھا اور مسلمان ان کو بنظرِ احتساب دیکھتے تھے۔ سر سید نے انگریز دوستی پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اپنے لیے اعتراضات کے

نئے اسباب بھی پیدا کر لیے۔ عقائد و افکار میں تحریک پیدا کرنے کی غرض سے انھوں نے تجدد پسند نظریات پیش کیے اور نئی کلامی بحثیں چھیڑ دیں۔ اس طرح ان کا مسلک علمائے دیوبند کے مسلک کی نقیض نظر آنے لگا اور مخالفت کے طوفان نے اس قدر زور مارا کہ آپ کو قتل کی دھمکیاں دی جانے لگیں اور بعض علما نے آپ کی تکفیر تک کر دی۔ ہوا یہ کہ اپنی تفسیر قرآن اور دیگر تحریروں[1] میں سرسید نے آخرت، فرشتوں، شیاطین، جنت اور دوزخ وغیرہ کی نئی فکری اور کلامی تعبیرات پیش کیں، اور اس کے نتیجے میں سیاسی اختلافات (مثلاً انگریزوں کی دوستی یا دشمنی) نے دینی مخالفت کی شکل[2] اختیار کر لی اور سرسید کو منفور خطابات سے یاد کیا جانے لگا مگر اس عملی انسان نے اپنا کام جاری رکھا۔

سفرِ انگلستان کا شاخسانہ

سرسید مرحوم نے اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان بھیجا تھا۔ ۱۸۶۹ میں وہ خود بھی وہاں پہنچے اور اعیان و اکابر سے ملاقات کی۔ ملکہ وکٹوریا سے بھی ملے اور ہر جگہ فرنگیوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سرسید نے وہاں کے مدارس اور اعلیٰ درسگاہیں دیکھیں اور ہم وطنوں کے لیے عام طور پر اور مسلمانوں کے لیے خاص طور پر ایسے مدارس کی موجودگی کی آرزو کی۔ انگلستان میں سرسید کی غیر معمولی تکریم، ان کے مخالفوں کی مزید مخاصمت کا موجب بنی۔ عام مسلمانوں کو بتایا جاتا رہا کہ سرسید انگریزی استعمار کے استحکام کے لیے کام کر رہے ہیں اور دین کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر متجددانہ بلکہ مخالفانہ ہے۔ انگلستان سے واپسی کے چند سال بعد ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں جب انھوں نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ قائم کیا، اور اس میں چند انگریز اساتذہ پڑھانے لگے، تو لوگوں کے شبہات میں مزید اضافہ ہوا۔ یہ اساتذہ انگریزی اور جدید علوم پڑھانے کے لیے متعین تھے مگر مسلمانوں کو خدشہ تھا کہ اس طرح عیسائیت

---

[1] دیکھیے حیاتِ جاوید مؤلفہ حالی مرحوم، بالجون کی کتاب "سرسید احمد خان کی اصلاحات و افکار" اور بشیر احمد ڈار کی تالیف "سرسید احمد خاں کے دینی افکار" (ہر دو بزبانِ انگریزی) (مترجم)

[2] زعماء الاصلاح مؤلفہ احمد امین مرحوم میں سرسید کے بارے میں تعصب اور مبالغہ آمیز حصہ کام لیا گیا ہے۔

کی تبلیغ کی جائے گی اور مسلمانوں کے عقائد و افکار کو خراب کیا جائے گا۔ ہم نے سرسید کی مخالفت کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ مگر اس مزاحمت کے باوجود سرسید اور ان کے روشن خیال حامیوں نے اپنے اصلاحی کام کو جاری رکھا اور اس طرح تجدد و اصلاح کا زینہ ہموار کر کے دم لیا۔[۵۱]

جمال الدین افغانی کی مخالفت

سید جمال الدین افغانی مرحوم جنگ آزادی کے قریبی سالوں میں ہندوستان آئے تھے۔ ۱۸۷۹ء میں مصر سے جلائے وطن کیے جانے پر دوبارہ آئے اور حیدر آباد دکن میں قیام کیا۔ آپ انگریزوں کے بے حد مخالف تھے جبکہ سرسید کا نظریہ اس کے برعکس تھا۔ علاوہ ازیں ان دنوں سرسید کی جدید کلامی بحثوں اور دین کو سائنس سے ہم آہنگ کرنے کی کوششوں کا عام چرچا تھا اور بالعموم لوگ ان مساعی کے خلاف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سید جمال الدین کو بھی اس مخالف ماحول میں سرسید کے خلاف لکھنا اور بولنا پڑا۔ آپ نے سرسید کو ڈاروِن کے مادی نظریات کا حامی گردانا اور رسالہ "ردّ نیچریہ" اور دیگر تحریروں (مثلاً ہفت روزہ العروۃ الوثقیٰ[۱] کے بعض شماروں میں) سرسید کے خلاف لکھا۔ رسالہ ردّ نیچریہ کو بعد میں شیخ محمد عبدہٗ اور عارف آفندی نے 'الرد علی الدھریین' کے عنوان سے عربی میں ترجمہ کیا اور چھپوایا۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو جمال الدین کی مخالفت، علمائے ہند کی مخالفت کا ہی ایک جزو تھی۔ مقامی علماء نے جو کچھ سرسید کے خلاف لکھا تھا، سید جمال الدین جیسا روشن فکر شخص سرسید کے خلاف وہ نہ لکھتا.....[۵۲]

سرسید احمد خاں ایک ترقی پسند مسلمان تھے۔ وہ اسلام کے حرکت پذیر تقاضوں اور عصری امور سے آگاہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ان کا اور ان کے با اثر رفقا کا اخلاص تھا جس نے ایک کامیاب تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ ان کی زندگی میں علی گڑھ تحریک نے کافی کامیابیاں حاصل کر لی تھیں اور بعد میں ان کی درس گاہ کے فارغ التحصیل افراد نے

---

۵۱ سید طفیل احمد (علیگ): ہندوستان کا روشن مستقبل ص ۷۳۔

۵۲ ڈاکٹر قاسم محمود: جمال الدین الافغانی، ص ۵۲۔

اس مشن کو آگے بڑھایا۔ بعد مسلمان معنوی کامیابی سے بہرہ مند ہوئے اور کوئی نصف صدی میں ایک نئی مملکت "پاکستان" کا قیام عمل میں آگیا۔ سر سید احمد خان ۲۷/۳/۱۸۹۸ء میں فوت ہوئے اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے احاطہ میں دفن کیے گئے۔ مدرسۃ العلوم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے موجود ہے[1] جو ہندوستان کی درجہ اوّل کی درسگاہوں میں شمار ہوتی ہے۔

کانگرس کا قیام اور مسلمانوں کا ردِ عمل

کانگرس کو انگریزوں نے قائم کروایا تھا اور بعد میں اس نے ہندوؤں کے مفادات کے تحفظ کو اپنا لائحہ عمل بنایا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے عواقب مایوس کن تھے۔ مسلمان خاص کر سرکار انگریزی کے معتوب تھے۔ مگر ظاہر ہے کہ ظلم و جور کا دور زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ مسلمان پوری قوت سے حالات کو بہتر بنانے کے لیے کوشاں ہوگئے۔ ہندو بھی سرکار کی پالیسی سے بہت زیادہ خوش نہ تھے۔ انگریزوں کو خطرہ تھا کہ مبادا برّ عظیم کے مختلف العقیدہ لوگ ایک ہو جائیں اور کسی دوسری جنگ کو شروع کر دیں۔ اس لیے انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی قوت کے انفکاک کا منصوبہ بنایا اور ایک ہندو نواز جماعت نیشنل کانگرس قائم کر دی گئی۔ مگر یہ کام ایک خاص ماحول میں تشکیل ہوا تھا۔ جن چند ہندو اور مسلمان طلبہ نے انگلستان میں تعلیم حاصل کی تھی وہ انگریز کی دوغلی پالیسی پر سخت تنقید کرتے تھے۔ ایک طرف انگلستان کا جمہوری انداز تھا اور دوسری طرف برّ عظیم نیز دیگر برطانوی نوآبادیوں میں ان کا استبدادی وطیرہ۔ انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا نے اس سفید فام استعمار گر کی سیاہ دلی کو خوب نمایاں کیا۔ رفتہ رفتہ برّ عظیم کے کونے کونے سے معاشی استعمار اور سیاسی استبداد کے خلاف آواز بلند ہونے لگی۔ کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں ان دنوں آزادیٔ صحافت کی حمایت میں جلوس نکالے گئے اور انگریزوں سے مطالبہ کیا گیا کہ ظلم و تعدی کی پالیسی کو ترک کر دیں۔ ان حالات میں انگریزوں نے اصل مطالب سے توجہ ہٹانے کے لیے اور طفل تسلی کی خاطر ایک سیاسی جماعت تشکیل دینے

---

[1] بھارت کے متعصب حکمرانوں نے اب مسلم یونیورسٹی کا نام تک بدل دیا ہے۔

کو باصواب جانا۔ چنانچہ وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن کے اشارے پر ایک ریٹائرڈ انگریز ا ہیوم نے اس جماعت کی تاسیس کا منصوبہ بنایا۔ جس کا اولین مقصد مخالفت کی جگہ حمایت حاصل کرنا اور ہندوؤں کو نوازنا تھا۔ حکومت کا خیال تھا کہ اس پلیٹ فارم سے وہ اپنے لیے حمایت حاصل کرلے گی۔ بہر حال ان چند سطور کو ہم نے اس لیے لکھا کہ کانگرس کے ابتدائی مقاصد بتائے جائیں اور یہ بات ذہن نشین کرلی جائے کہ آزادی کے حصول کی کوشش کرنے والی یہ جماعت ابتدا میں ایسی نہ تھی اور شروع شروع میں اس نے حُبِّ وطن کا جو درس دیا، وہ انگریز دوستی کا آئینہ دار تھا۔

کانگرس کے پہلے قابلِ ذکر لیڈر مسٹر بنرجی تھے۔ انھوں نے ۱۸۸۵ء میں اس جماعت کا پہلا اجلاس بمبئی میں منعقد کروایا اور اس میں انگریزی حکومت کی 'خدمات' کی جی بھر کر توصیف کی اور بتایا کہ برِّعظیم کے باشندوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ یہ حکومت یہاں پر قائم رہے۔ انھوں نے مغربی علوم وفنون کے حصول کی ضرورت پر بھی زور دیا تھا۔ کانگرس کے ایک اعلیٰ رکن گوپال کرشن گوکھلے نے کہا تھا:

"اہلِ ہند کا بہترین مفاد اسی میں ہے کہ وہ انگلستان کے ساتھ اپنے روابط کو استوار رکھیں۔"[۱] ظاہر ہے کہ ایسے وفادارانہ بیانات سے انگریز خوش ہوتے تھے۔

مسلمانوں کی شرکت

کانگرس کو کل ہند نمائندہ جماعت بنانے کے لیے مسلمانوں کو بھی اس میں شریک کرنا ضروری تھا۔ انگریزوں اور ہندوؤں کی کوشش سے مسلمانوں کا ایک قلیل گروہ اس میں شریک ہونے لگا۔ مگر اکثریت کو اس جماعت سے نفرت تھی۔ سرسید احمد خان کانگرس کے عزائم کو بھانپ گئے تھے اور اس میں شرکت کے خلاف تھے۔ بہر حال کانگرس کے پہلے اجلاس منعقدہ بمبئی میں بنرجی کے ساتھ ساتھ سید رحمت اللہ نامی ایک مسلمان کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اس اجلاس میں، جس میں ۷۸ ارکان نے شرکت کی، وہ غالباً ۲ واحد مسلمان تھے۔ ایک سال کے عرصے

۱۔ الہند و الغرب ص ۲۲

میں مسلمانوں کو یہ احساس ہوگیا۔ کہ سرکار اس جماعت کی کوششوں کو بنظرِ استحسان دیکھتی ہے اس لیے مسلمانوں کو اپنے مفادات کے لیے شرکت کرنا چاہیے۔ دوسرا اجلاس دارالحکومت کلکتہ میں منعقد ہوا تھا۔ تیسرا (۱۸۸۷ء کا) سالانہ جلسہ مدراس میں ہوا اور اگرچہ مسلمان ارکان کی تعداد ۸۳ ہی رہی، کل ارکان کی تعداد ۶۰۴ ہوگئی۔

مرورِ ایام سے کانگرس کا موقف بدلنے لگا۔ ہندو اور مسلم ارکان نے برعظیم کے لوگوں کے مفادات کے لیے آواز بلند کرنا شروع کی اور انگریزوں نے محسوس کر لیا کہ یہ جماعت سرکار کی حمایتی اور کاسہ لیس نہیں رہ سکتی۔ اس لیے اس کی سرگرمیوں کا کسی دوسرے طریقے سے سدِباب کیا جائے۔ کانگرس کے ارکان اب اپنے وجود کے تشخص کا ثبوت دینے کی کوشش کر رہے تھے مگر انگریز اس کے ارکان کی قوت کو مجتمع ہونے سے روک رہے تھے اور اس کام کے لیے انھوں نے اپنی عام حکمت عملی سے کام لیا:

چیست تدبیر ملوکیت؟ اشتقاق

پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔

مندرجہ بالا عنوان انگریز کی اس پالیسی کا آئینہ دار ہے جو اس نے اپنے جملہ محروسہ علاقوں میں نافذ کر رکھی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس روش کو اپنا کر برعظیم میں اپنے قدم جمالیے تھے۔ انگریز نے اپنے نظامِ تعلیم کے ذریعے برعظیم کے باشندوں، خصوصاً مسلمانوں کے خیالات بدلنے شروع کیے۔ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے کی تدبیریں اختیار کیں۔ اپنے نصابِ تعلیم میں انھوں نے برعظیم کے سابق حکمران مسلمانوں کی ایسی تصویریں پیش کیں جس سے ہندوؤں کے جذبات مسلمانوں کے خلاف بھڑک اٹھتے تھے۔ مثلاً یہ بتایا جاتا تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کا اصلی وطن ہے اور مسلمانوں نے زبردستی یہاں قبضہ جمایا ہے۔ یا مثلاً لکھتے تھے کہ فلاں فلاں مسلمان بادشاہوں اور حاکموں نے ہندوؤں پر مظالم ڈھائے اور ان کے مذہبی شعائر برباد کیے ہیں۔ دوسری طرف انگریز مسلمانوں کو اکساتے تھے کہ ہندوؤں سے اچھے رہیں۔ ۱۸۲۱ء میں ایک انگریز سیاست دان نے اپنی نفاق انگیز پالیسی کے متعلق جو کچھ کہا تھا لارڈ ڈلہوزی/ایلفنسٹن نے ۱۸۵۸ء میں اسے یوں واضح کیا:

"پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔۔۔۔ برعظیم میں اسی پالیسی پر چل کر ہم حکومت کر سکتے ہیں۔"

سر جان ملکم نے لکھا تھا:

"برعظیم میں ہماری حکومت کے جاری رہنے کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ اکثریت اور اقلیت میں نفاق ڈال سکیں۔"

بہر طور مذکورہ پالیسی کے تحت انگریزی حکومت عجیب پانسے بدلتی نظر آتی تھی۔ کبھی ہندو منظورِ نظر ہیں تو کبھی مسلمان۔ آج ایک قوم معتوب ہے تو کل دوسری۔ کبھی ایک قوم کی پشت پر ہاتھ رکھ کر اسے دوسری سے لڑاتے تھے اور کبھی اس کے برعکس۔ غرض اس طرح ایک تو ان دونوں قوموں کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی اور دوسرے یہ قومیں انگریز کے خلاف رہ کر اپنی جداگانہ حیثیت منوانے میں کوشاں ہوگئیں۔ ہندوؤں کی اکثریت تھی اور وہ مسلمانوں کو ایذا پہنچانے کے درپے تھے۔ مسلمان بھی مقاومت کرنے اور اپنے حقوق کے دفاع کے لیے آمادہ رہتے تھے۔ مگر جیسا کہ اوپر عرض کر دیا گیا ہے مسلمانوں کے اندر بھی دو واضح گروہ بن گئے تھے: علمائے دیوبند کے ہمنوا اور سر سید احمد خان کے حامی۔ ابتدا میں یہ دونوں گروہ ہندوؤں کے خلاف متحد ہو جاتے تھے۔ بعد میں البتہ کانگرس کے ہمنواؤں نے مسلمانوں کے خلاف برملا کام کیا۔

غلط ہے

اردو اور ہندی کا تنازعہ

اردو ہندی نزاع کو تلک اور بعض دیگر متعصب ہندوؤں نے شروع کیا۔ اس نزاع سے معلوم ہوگیا کہ یہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے ساتھ نباہ نہیں کر سکیں گی۔ ہوا یہ کہ ہندوؤں نے اردو کو عربی اور فارسی الفاظ کی موجودگی کی بنا پر خالصتہً مسلمانوں کی زبان قرار دیا، اور ہندوؤں کو اس امر کے لیے تیار کیا کہ وہ ہندی پڑھیں اور سیکھیں۔ متعصب ہندو بے جا مطالبہ کرتے تھے کہ اردو سے عربی اور فارسی کے الفاظ خارج کر دیے جائیں اور ان کی جگہ ہندی کے الفاظ بولے اور لکھے جائیں۔ مسلمان اپنی مذہبی اور ثقافتی زبانوں کے دفاع میں کہتے تھے کہ ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا۔ نیز یہ نزاع ہندو اکثریت کے عزائم کی مظہر تھی اور مسلمان دیکھ رہے تھے کہ اگر ایسے متعصب لوگوں کو زیادہ اختیارات مل گئے تو وہ کیا کچھ کرنے کا سوچیں گے۔

اُردو ہندی نزاع کا ذکر ہم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاف کے ایک نمونے کے طور پر کیا ہے ورنہ ہندوؤں کے تمام دیگر اقدامات سے بھی تعصّب مترشح تھا۔ ان حالات کی وجہ سے مسلمان سرکار کی حمایت کرنے اور اپنے اتحاد و اتفاق کے ذریعے اپنی دفاعی قوت بڑھانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ انھیں اپنے وجود کے اثبات اور ملّی تشخص کی فکر تھی۔ یہی فکر، جیسا کہ بیان ہو گا، بعد میں نمایاں تر صورت میں ظاہر ہوتی رہی اور اسے نظریۂ پاکستان کی اساس کہنا چاہیے۔ پروفیسر عباس عقاد مرحوم نے لکھا ہے:

"سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو اپنا ملّی وجود برقرار رکھنے کی تلقین کی۔ یہی تلقین مرورِ ایام سے ایک جداگانہ اسلامی مملکت کے قیام کی محرک ثابت ہوئی مگر تلک اور دیگر متعصب ہندوؤں کی باتیں بھی مسلمانوں کے دفاعی ردِّ عمل کا موجب بنی تھیں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ہندوؤں سے علیحدگی اختیار کرنے میں ان کے دین و ثقافت کے تحفظ کا سامان مضمر ہے۔"[1]

سر سید احمد خان کے صائب مشورے

سر سید نے جداگانہ اسلامی مملکت کا ذکر کبھی نہیں کیا مگر مسلمانوں کو بار بار یہ صائب مشورہ دیا کہ اپنی صفوں میں انتشار نہ آنے دیں اور مختلف انتخابات میں مسلمان نمائندوں کو ووٹ دیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے کانگرس میں شریک ہوں تاکہ اپنے حقوق منوا سکیں۔ مگر زندگی کے آخری سالوں میں وہ ہندو مسلم اتحاد اور ان کے ایک پلیٹ فارم پر کام کرنے سے مایوس ہو گئے تھے اور مسلمانوں کو مشورہ دیتے تھے کہ اپنے حقوق منوانے کے لیے مؤثر آواز اٹھائیں اور کانگرس کی اس جماعت سے جس میں اکثریت ہندو ارکان کی ہے بہبودی و حمایت کا خیال ترک کر دیں۔

سر سید احمد خان نے کانگرس کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ جماعت ایک ہندو استعماری نظام قائم کر دے گی اور اس میں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہ رہے گی۔ بلکہ یہ لوگ استعماریت کے حامل انگریزوں سے بھی بدتر ثابت ہوں گے۔ اور مسلمانوں کے ایک دوسرے نسبتاً قلیل گروہ کو کانگرس سے چنداں وحشت نہ تھی۔

---

[1] محمد علی جناح؛ مطبوعہ تہران۔

ان کا خیال تھا کہ بعد میں متعصب ہندوؤں کی جگہ ان کے معتدل مزاج ارکان آجائیں گے اور اس طرح تعصّب و منافرت کا دَور دورہ ختم ہو جائے گا۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے انگریز پرنسپل مسٹر بک نے ان دنوں ایک "وطن دوست انجمن" بنائی تھی جس کے بعض مقاصد کانگرس کے علی الرغم تھے اور کافی مسلمان اس کے ارکان بن گئے۔ بعد میں کچھ ہندوؤں نے بھی آ کر شرکت کی۔ "وطن دوست انجمن" کے قیام میں سر سید احمد خان کی مساعی کارفرما تھیں انھوں نے اس وقت صریحاً لکھا کہ ان کے نزدیک مسلمانوں کی کانگرس میں شرکت خلافِ مصلحت ہے۔ کیونکہ یہ جماعت صرف ہندو مفادات کا خیال کرے گی اور مسلمانوں کو اس سے کچھ نہ ملے گا۔ سر سید احمد خان کے اس اعلان کے بعد ۱۸۸۸ء میں بعض علما نے کانگرس میں شرکت کے عدم جواز اور حرمت کے بارے میں فتویٰ صادر کیا تھا۔ اس فتویٰ کے خلاف ایک دوسرا فتویٰ جاری ہوا۔ اس فتویٰ کے جاری کرنے والے ممتاز علما تھے اور انھوں نے جنگِ آزادی میں شرکت کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ "محب وطن انجمن" برعظیم کے باشندوں کی قوت کو پراگندہ کر دے گی اور اس میں شرکت حرام ہے جبکہ کانگرس سے تعاون عین مصلحت ہے۔ اس فتوے کو شیخ عبدالقادر دہیانوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور شیخ محمود حسن جیسے علما نے جاری کیا تھا اور بعض لوگ "نصرۃ الابرار" کی خاطر کانگرس کے ہمنوا بننے لگے تھے۔ یہ ہمنوائی مدتوں جاری رہی اور اس کے اجرا کی تحریک سر سید کی مخالفت کا نتیجہ تھی۔ اگرچہ فتویٰ میں مسٹر بک (انگریز) کی قیادت پر اعتراض تھا، مگر اصل ہدفِ تنقید سر سید مرحوم تھے۔

ردِّ عمل

مسٹر بک اور ان کے دوستوں نے ۱۸۹۳ء میں "محمڈن اینگلو اورنٹیل ڈیفنس سوسائٹی" بنائی جس کے مقاصد وہی تھے جو "محب وطن انجمن" کے تھے۔ اس میں کافی انگریز اور مسلمان شامل ہو گئے اور ہندوؤں کے خلاف اپنے حقوق کا دفاع کرنے لگے۔ یہ سوسائٹی خاصی مستعد تھی اور اس نے ہندوؤں کو معقول رویہ اختیار کرنے کی ضرورت پر سوچنے کے لیے مجبور کر دیا۔ سر سید احمد خاں اور مسٹر بک کے انتقال (۱۸۹۸ء اور ۱۸۹۹ء) کے بعد مدرسہ علی گڑھ کے نئے پرنسپل مسٹر مارلن نے یہ کام سنبھالا۔ اس وقت صوبہ یو۔ پی میں اردو اور ہندی کا تنازعہ برپا تھا اور

اس وقت ایک تیسری انجمن "محمڈن پولیٹیکل افیئرز سوسائٹی" کا قیام بھی عمل میں آیا۔ کانگرس اور یہ سب انجمنیں اگرچہ انگریزوں نے قائم کروائی تھیں، مگر بعد میں انھوں نے ہندو اور مسلم مفادات کے لیے جداگانہ کام شروع کر دیا تھا۔ مذکورہ انجمنیں اس ہندو نواز جماعت کانگریس کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آئی تھیں۔ سرسید مرحوم نے کہا تھا کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں ہندو اور مسلمان دو مختلف اور جداگانہ بڑی جماعتیں ہیں مشترک انتخابی طریقہ موثر اور مفید نہیں رہے گا۔ مسلمانوں کو اپنے دین و ثقافت کو تحفظ دینا ہے تو اپنا جداگانہ ملی تشخص منوائیں ورنہ وہ اکثریت میں ایسے مدغم ہو جائیں گے جیسے آٹے میں نمک ہوتا ہے۔ جو حضرات کانگرس کے حامی تھے وہ حُبِّ وطن کا نام لیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ "حبِ وطن" کے تحت ہندو مسلمان متحد ہو کر اپنے حقوق منوالیں گے اور یہ امر دین و ثقافت کے زیاں کا موجب نہ بنے گا مگر بعد میں لوگوں نے دیکھ لیا کہ اس گروہ کی رائے صائب نہ تھی۔ ہمارے خیال میں ہندو مسلم نفاق کی وجہ سے انگریزوں کو تقریباً نصف صدی اور حکومت کرنے کا موقع مل گیا ورنہ اگر ہندو اور مسلمان متحد ہوتے تو انھیں جلد ہی انگلستان کی راہ لینی پڑتی :

دو دل گر یک شوند، بشکنند کوہ را

انگریزوں نے اپنی پالیسی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" جاری رکھی۔ اسی کے تحت بنگال کی تقسیم اور اسے پھر متحد کرنے کی نفاق انگیز پالیسی اپنائی گئی مگر اس طرح مسلمانوں کو خاطر خواہ تجربات حاصل ہو گئے اور آخر کار انھوں نے ایک ایسی سیاسی جماعت "آل انڈیا مسلم لیگ" قائم کر لی جس نے کانگرس کے چیلنج کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔

(باقی آئندہ) لیگ بھی انگریز ہی نے قائم کی تھی